عرفان صدیقی کی شاعری کا استعاراتی نظام

محمد رضوان خان

D-307، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025، موبائل:9810862283

عرفان صدیقی کی شاعری میں کربلا کے معنوی اور استعاراتی پہلو نمایاں نہ بھی ہوتے تب بھی چوں کہ ان کی شاعری میں خیال، فنی رموز، تخیل کی بلندی، فکری صلابت اس قدر برتے گئے ہیں کہ شاعری دور سے پہچانی جاتی۔ اس میں دورائے نہیں کہ عرفان صدیقی نے کربلا کے تاریخی، مذہبی اور جذباتی واقعہ کو جس خصوصیت اور عصری معنویت سے برت کر انسانی حسیات سے قریب تر کرنے اور عقیدتوں کے چراغ کی مدھم لو کو تیز کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، وہ واقعہ معجزۂ کربلا کا فیض بھی ہے اور معجزۂ فن بھی۔ بہرطور یہ جان لینا چاہیے کہ عرفان صدیقی کی شاعری میں واقعۂ کربلا نمایاں اور ابھرا ہوا تو ضرور ہے مگر ان کی شہرت صرف اس تاریخی واقعہ کے برتنے سے نہیں بلکہ ان کی شاعری کی جملہ خصوصیات نے انھیں جدید شاعری میں ایک اہم اور نمایاں مقام عطا کیا ہے۔

عرفان صدیقی کا ایک خاص امتیاز یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری مستقبل کے بجائے ماضی پر اثر انداز رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہم عصروں اور جونیئر شعرا نے ان کی پیروی کی ہے۔ ایلیٹ نے بڑی اچھی اور معنی خیز بات کہی تھی کہ نئی اور سچی تخلیقی صلاحیت سے مالا مال شاعر اپنے مستقبل پر ہی نہیں، اپنے ماضی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، ایلیٹ کا یہ قول عرفان صدیقی کی شاعری پر صادق آتا ہے۔ ان کے یہاں تلمیحات، تہذیب وثقافت کے مشترکہ علائم، شعری پیکر، اس کی تجسیم اور اظہاریت کے نئے ضابطے، اصول اور تکنیک کے ساتھ قدیم وجدید کا ایک تازہ اور انوکھا رویہ معلوم ہوتا ہے، ساتھ ہی ان کی تخلیقی بصیرت لسانی وفنی شعور کے ادراک کا حاشیہ معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی فنی پختگی اور شعوری صلابت کا اظہار استعاراتی پیکر تراشی کے ساتھ عصری منظرنامے پر خوب کیا ہے جو انھیں معاصر ادبی منظرنامے سے منفرد کرتی ہے کیونکہ ان کی شاعری پیکر کی جدت، ندرت مضمون، تخیل کی کارفرمائی اور الفاظ کی جدت سے مملو معلوم ہوتی ہے۔ عرفان صدیقی کے یہاں تلخیٔ احساس کا اظہار معتدل اور باوقار طریقے سے ہوتا ہے مگر یہ احساس کی تلخی المیاتی صورت کبھی اختیار نہیں کرتی کیونکہ ان کے ذہن اور فکر کا ارتباط اس قدر مستحکم اور بالیدہ ہے کہ جذبے کی سرشاری میں اپنا توازن برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کی دوسری بڑی خوبی تخلیقیت سے پُر ذہنی اور فکری رویے کا برتاؤ ہے جس کی صورت میں نئی زمینوں میں غزل کہنے کا عمل ہے جس کے نتیجے میں ندرت مضمون، جدت احساس، شعریت اور شاعری میں پیکر کی جدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے یہاں استعارے سے زیادہ پیکر میں تازگی محسوس کرتے ہیں، جس کی بدولت ہمیں ان کی شاعری میں نئے الفاظ اور نئے فقروں کی کثرت نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی ان کے اسلوب میں نیرنگی اور فکر میں جدت ہے اور زیادہ تر جگہوں پر ذاتی واردات کا خوبصورت اظہار معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسا اظہار ذاتی واردات اور تجربے کی بنیاد پر ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ اس ندرت اظہار سے ان کے خیالات کی نزاکت اور نوع بہ نوع ڈکشن کے نئے نئے اظہار ان کے شعوری احساس کا رمز یہ نہیں بلکہ خیالات کی رعنائی اور تصورات کی نمو پذیری کا لازمہ بنتے ہیں، جس سے ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی فضا پیدا ہوجاتی ہے اور اظہار کا منفرد برتاؤ قاری کو فوری طور پر متاثر اور مائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے:

تیرے لیے میں دوستوں سے کرتا رہا جنگ
تو میرے دشمنوں سے خفا کیوں نہیں ہوا

چلو اب آسماں سے اور کوئی ربط سوچیں
بہت دن ہوگئے حرفِ دعا سے کچھ نہیں ہوتا

عاشقی کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں
زخم کھایا ہے تو کیا حشر اٹھانے لگ جائیں

عرفان صدیقی اپنے تیور کے شاعر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی بانگ دور تک اور دیر تک سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں منفرد لہجے اور

دھار دار تیور کے مہتم بالشان شاعر تھے۔ وہ اپنے لہجے میں جب خدا سے شکوہ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خدا سے شرف ہم کلامی سے سرشار ہوکر سلسلہ دراز کرنا چاہتے ہیں، یہی ان کی شاعری کا حسن ہے۔ پہلے شعر میں شاعر اپنے رب سے سوال کرتا ہے کہ اے میرے رب میں اپنے دوستوں سے صرف اور صرف تیری خاطر برسر پیکار ہوں اور ایک تو ہے کہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی خاموش ہے۔ آج دانگ عالم میں قوم مسلم بدحال اور پریشان ہے، تیرے دشمنوں کا عتاب ان پر آئے دن سخت سے سخت ہوتا جارہا ہے، ان کی عزت و ناموس پامال کی جارہی ہے، چہار سو خون ارزانی کا بازار گرم ہے، انھیں تہہ تیغ کیا جارہا ہے، تو پھر بھی خاموش ہے۔ یہ بات محل نظر رہے کہ شاعر خدا کی خدائی کا منکر نہیں ہے اور نہ ہی وہ خدا کے جلال و جمال کا منکر ہے، چوں کہ وہ عابد ہے اور وہ معبود تو بندے کا اتنا تو حق بنتا ہی ہے کہ وہ اپنے برے حالات میں اپنے خدا سے دست سوال دراز کرے، شاعر جب یاس و ناامیدی کے گھنگھور بادل کو مزید سیاہ ہوتے دیکھتا ہے تو اس کی مایوسی میں اور اضافہ ہوجاتا ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ شاید آسمان والا مجھ سے خفا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری دعاؤں کی رسائی آسمان تک نہیں ہورہی ہے یا پھر ہماری دعا اثر کھوچکی ہے، تو چلو کچھ اور تدبیر کرتے ہیں۔ شاعر جیسے جیسے یاسیت کی وادی میں قدم بڑھاتا جاتا ہے، اس کی ناامیدی اور بڑھتی جاتی ہے، اس کے سوال کا رنگ اور بھی گہرا ہوتا جاتا ہے۔ دوسرے شعر میں وہ مجبور و لاچار اپنے رب سے دست سوال دراز کرتا ہے کہ اے پروردگار عالم تیرے اس خرابے میں جنگ و جدال کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں، قتل و غارت گری اور خون ریزی کا یہ بازار تو ازل سے گرم ہے، اگر دنیا میرے اس سوال پر بدنداں ہے کہ جس نے مجھے گویائی عطا کی میں اسی سے ہی الجھ بیٹھا، تو ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ قابیل نے جب ہابیل کا خون کیا تھا تو روئے زمین پر گرنے والا یقیناً وہ پہلا خون تھا مگر یہ سلسلہ آج تک دراز ہے، یہ اور بات ہے کہ میری فغاں اور میرا اظہار کرب اوروں سے ذرا مختلف ہے، مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ دنیا میں جو حشر آج بپا ہے، اس سے پہلے کبھی بپا ہوا ہی نہیں، بلکہ اس سے پیش تر بھی حشر بپا ہوتا رہا ہے اور خلق خدا نے اپنی بیزاری کا اظہار بھی کیا ہے مگر ان کی فغاں نہ تب سنی گئی تھی اور نہ اب سنی جارہی ہے۔ جب شاعر کو یہ احساس ہوجاتا ہے کہ میری فغاں کا کوئی اثر نہیں ہورہا ہے تو پھر شاعر اپنی بات کو مؤثر بنانے کی غرض سے دوسرے وسیلۂ اظہار کو اپنا وطیرہ بناتا ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں واقعہ کربلا اہم واقعہ مانا جاتا ہے اور اس واقعہ کو وسیلۂ اظہار بنانا مؤثر اور کامیاب وسیلہ مانا جاتا رہا ہے، جب شاعر کا کرب انجذابی کیفیت اختیار کرلیتا ہے تو اس کیفیت کا اظہار بھی شاعر شدت سے کرتا ہے۔ شاعر اس حوالے سے تیسرے شعر میں اظہار غم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب حضرت عباسؓ پانی کی طلب میں نیزوں کی زد میں رہ کر بھی تجھے پکارتے ہیں المدد المدد اور ادھر دشمن برسر پیکار ہے کہ موقع پاتے ہی حضرت عباسؓ کا سر تن سے جدا کردے، اے میرے رب امت پر آج بھی ویسے ہی نامساعد حالات ہیں اور پوری دنیا چیخ رہی ہے اور چہار جانب سے تجھے مدد کے لیے پکارا جارہا ہے، اے کاش میرے اس صدا کی رسائی تجھ تک ہو جاتی، مایوسی کے باوجود شاعر پرامید نظر آرہا ہے کہ خدا تعالیٰ ایک نہ ایک روز ضرور میری صدا سنے گا دراصل یہی شاعر کی کامیابی ہے اور صاحب ایمان ہونے کی علامت بھی، اسی پرامیدی میں شاعر کے لہجے میں تھوڑی سی نرمی آجاتی ہے اور لہجے کی یہی تبدیلی بتا رہا ہے کہ شاعر اب کامیاب ہونے والا ہے، اس کی صدا کی رسائی بارگاہ رب میں عنقریب ہونے ہی والی ہے۔ لہٰذا شاعر چوتھے شعر میں کہتا ہے کہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان دو طرفہ اور پاکیزہ رشتہ محبت ہے، بایں ہمہ عشق میں زخم کھانے کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ واویلا کھڑا کیا جائے، آہ و بکا کیا جائے اور حشر بپا کیا جائے، بلکہ عشق میں ملنے والے زخم جگر، رنج والم اور ذہنی اذیتیں در اصل عاشق کا سرمایۂ حیات ہوا کرتی ہیں، اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے اور یہ مصیبتیں کم ہی لوگوں کے نصیب کا حصہ بنتی ہیں بلکہ حقیقی شاعر تو انہیں سنجو کر رکھتا ہے، عرفان صدیقی بھی میر تقی میر کی طرح پاس ناموس عشق کا خیال کرکے خاموشی اختیار کرلیتے ہیں:

پانی پہ کس کے دست بریدہ کی مہر ہے
کس کے لیے ہے چشمۂ کوثر لکھا ہوا

در ماندگاں پہ تنگ ہوئی کیوں تری زمیں
دروازہ آسمان کا وا کیوں نہیں ہوا

مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی

عرفان صدیقی کے یہاں ہمیں کثرت مضامین کے ساتھ متنوع خیالات کی پیکر تراشی ملتی ہے، جس سے شعر کا جمالیاتی حسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ ان کے یہاں فکر و خیال میں سنجیدگی، شائستگی اور اظہار و بیان میں سلیقہ اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ لہجے کی تازگی کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے، جس

سے قدیم وجدید تہذیبی فضا کی ایک نئی قوس قزح مطلع شعر پر نمو پذیر ہوتی ہے۔ان کے یہاں ہمیں دیگر زبانوں کی واقفیت کا احساس وادراک ہو نہ ہو مگر فارسی اور بالخصوص عربی زبان وادب سے گہری واقفیت کا ادراک ضرور ہوتا ہے۔انھوں نے اردو اور فارسی شاعری بالخصوص جدید غزل کے حوالے سے ذہنی وفکری یکسانیت اور مناسبت کا احساس دلایا ہے۔ساتھ ہی اپنی روایت کے عناصر کو جذب کر کے نئی شاعری میں اس طرح اور اس خوبصورتی اور ہنرمندی سے برتا ہے کہ ایک نئی فضا اور کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ان کی شاعری محسوسات وکیفیات کی شاعری ہے۔اس کا ایک بڑا حصہ کیفیتوں سے عبارت ہے،ان کے یہاں زندگی کئی رنگ میں رقصاں نظر آتی ہے،جس کے نتیجے میں زندگی کے مختلف مظاہر نظر آتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی شاعری میں رنج وراحت،نشاط وغم،بیم ورجا،یاس و امید سب محبت ہی کی گوناگوں کیفیتوں سے عبارت نظر آتی ہیں اور ان کی غزلوں میں ایک المیاتی وقار اور جہد رائیگاں کی تلخی کا احساس ہوتا ہے۔

دراصل عرفان صدیقی کی غزلوں کے جتنے رنگ نمایاں ہیں،ان میں ان کے جذبات کی جدت،مضمون کی نیرنگی،خیال کی تازگی،الفاظ کی ندرت،استعاروں کی چمک،نئی زمینوں کی روش،اصلاحات اور ترکیبوں کی جدت طرازی کا بڑا کمال ہے۔یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے ان عناصر کو جس خوش اسلوبی اور فن کے معجزانہ طور طریق سے برتا ہے،معاصر شاعری میں اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ان کی شاعری میں جن الفاظ کو مرکزیت حاصل ہے وہ یہ ہیں: سنگ،تلوار،وحشت،آفتاب،کشتی،سفینہ،سحر،کوچہ، بادصبا،پتھر،دعا،موسم،ندی،عکس،خوشبو،سراغ،راکھ،شعلہ،مژگاں، زنجیر،وصل،جان،بدن،دیوار،مسیحا،دشت،صحرا،جنوں،ستم گر،زوال، ختن،منظر،خیمہ،مٹی،تمثال،رت جگا،چنگل،پہاڑ،سخن،پیراہن،شہر، صدا،ستارہ،دریا،سمندر،لہو،پھول،ظلم،ستم،موسم،دھوپ،چھاؤں، پیاس،بارش،قریہ،رات،صدا،خنجر،آسماں،لشکر،فغاں،حشر،خاک، چراغ،دل،خون،حمائل،عکس،آئینہ،در،ہوا،محراب،دھواں،جسم،رقص، حجرہ،سایہ،پیکر،طناب وغیرہ۔ساتھ ہی انھوں نے نئی نئی ترکیبوں کا سہارا لے کر اپنی شاعری کو ایک نیا آہنگ عطا کرنے میں کامیاب ہیں بالآخر یہی تراکیب اور لفظیات ان کی شاعری کا شناخت نامہ ہے۔

دست عصائے معجزہ،فریاد کشت گاہ،چشم اعتبار،فصیل شب،چراغ راہ گزار،نبض عالم،دھوپ کا صحرا،ابر عنایت،بازوئے حمایت،چوب شجر، درد محبت،نقش ظفر،سرنوشت،لہو روشنائی،دست بریدہ،ستارۂ بدن، فہرست چاکراں،حزینہ گوہر،شور عزا،جذب عشق،گلوئے بریدہ،خانہ در، فاقہ سوار،زندانی ہجر،شہر طلسمات،خواب آسودگی،ترنگار ملال،اذن سفر، دست غائبانہ،جوئے وصال،مسافت ہجر،ہوائے وصال،چشم غزال، شام زوال،شہاب چہرہ،باب وصال،دنیائے جاں،زیر محراب،خلوت جاں،چراغ شب ہجراں،حلقہ زنجیر،زنجیر گراں،حسن خداداد،موج ہوائے غم ناک،برگ خزاں،قریہ نفاق،دل تکیہ نشیں،تبریک نان جویں، خریطہ زر،ستارہ داغ جبیں،اجازۂ بیعت،خاک فراموشی،ربط نوا،بازار سمن،بلائے پیرہن،زنجیر سفر،خون دوعالم،قریہ وصال،شب سفر،اتصال ظلمت،خوش خصال،سر مطلع مثال،طرف کوچہ ملال،عطیہ ترک طلب، شہر۔شہر بلقیس،نشینان یمن،گردہ خنجر،دیدۂ گریاں،جوئے تنگ آب، پیرہن تنگ،دشت بریدہ،سکوت خوف،لمس ہنر،مسند خاک،صدائے گریہ،غبار تیرہ شبی،کوفہ نامہرباں،ہلاکِ وفا،صف دوستاں،رفاقتوں کے چراغ،نعرۂ ہو،لوح طلسم،بساط رقص،شب نورد،طلم سیم،شاخ شجر، ساعت رفتہ،طاقِ تنہائی،سایۂ شب،غرفہ حیرت،نامہ جاں،بدن صحرا، شاخِ جاں،سخن سرا،یوسف شہر،غبار شب،خاک بدن،جوطشت موج، مآل شب غم،نقش کف پا،سکہ زر،گوہر ارزاہ،لذت یکجائی،سرشوریدہ، خیمہ شب،غرفہ خالی،بادیہ پیمائی،خوش بدنی،دریدہ پیرہن،بانوئے وغیرہ۔

عرفان صدیقی نے جن الفاظ اور تراکیب کے سہارے اپنی شاعری کی بلند وبالا عمارت تعمیر کی ہے وہ کوئی بہت نئی نہیں ہیں اور نہ وہ ان لفظیات اور ترکیب کے موجد ہیں،لیکن اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے جن لفظیات اور تراکیب کو اپنے خیال کا مرکز بنایا ہے اور اپنے اشعار میں برت کر مرکزیت عطا کیا ہے،اس میں جدت اور تازگی کا تڑکا ضرور لگا دیا ہے۔روایتی الفاظ اور ترکیب کو اپنے خیال وفکر کا محور بنانے کی روایت نو عرفان صدیقی کے یہاں بھی ملتی ہے مگر اس کے ذریعہ سے وہ نئی بات اور نئے خیال کو برتنے میں کامیاب ہیں اور یہی ان کی فکر کی تازگی اور خیال کی جدت ہے۔کیوں کہ انھوں نے لفظیات اور تراکیب کو برتنے میں کم وبیش اپنے پیش روؤں کا تتبع کیا ہے اور ان کے اثرات قبول کیے ہیں۔ان میں قدیم متقدمین میں شاہ نصیر،ذوق،مصحفی اور میر قابل ذکر ہیں اور جدید دور میں مرزا غالب سرفہرست ہیں۔اسی طرح اپنے ہم عصروں میں بندش الفاظ اور تراکیب وخیال سے ظفر اقبال اور افتخار عارف کے قریب ہیں۔اپنے متقدمین سے عرفان صدیقی کی قربت کہیں لفظیات کی سطح پر ہے کہیں لہجے اور ردیف وقوافی کی سطح تک ہمیں ملتی ہے اور ظاہر ہے اتنی قربت ایک دوسرے کو ایک زنجیر میں باندھنے کے لیے

کافی ہے۔کیونکہ ایک ہنرمند اور باکمال شاعر ماضی سے مستفید ہوکر اپنی راہ اور جہت خود متعین کرلیتا ہے اور یہ کمال انھوں نے کر بھی دکھایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ابھی پیکر ہی جلا ہے تو یہ عالم ہے میاں
آگ یہ روح میں لگ جائے تو کامل ہوجاؤ

روح میں کیسی تھکن ہے کوئی تدبیر کرو
شاید آسودۂ سر بستر تن ہوجاؤں

عمر کیا چیز ہے احساس زیاں کے آگے
ایک ہی شب میں بدل جاتی ہے صورت کیسی

وہ خوش بدن ہے نوید بہار میرے لیے
میں اس کو چھولوں تو سب کچھ نیا نیا ہو جائے

اردو شاعری کے منظرنامے پر عرفان صدیقی قدرتاخیر سے نمودار ہوئے، مگر خوبی یہ ہے کہ وہ جتنی تاخیر سے نمودار ہوئے اتنی ہی جلدی اپنی الگ شناخت قائم کرنے اور انفرادی شان قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ان کے اندر بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں پوشیدہ تھیں خواہ اسلوب کی سطح پر ہو یا ڈکشن کے اعتبار سے ہو اور وہ بھی اس وقت جب غزل کی دنیا میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے شاعر زور آزمائی کررہے ہوں اور نمائندہ شعرا کی قابل لحاظ تعداد پہلے سے صف بستہ ہو، ایسے میں نو واردوں کے لیے بڑا چیلنج درپیش ہوتا ہے، مگر عرفان صدیقی سنگ گراں تراش کر اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی شاعری میں کھرا پن اور تجربات ومشاہدات کے ساتھ سچی شاعری ہونے کا صاف احساس ہوتا ہے، انہی خوبیوں کی وجہ سے اردو دنیا میں ان کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔عرفان صدیقی نے صحت مند فکری رویے کے ساتھ اپنے روایتی دائرے میں محصور ہوکر اپنے زمانے کے مسائل کو استعاروں کے خوبصورت پیکر میں سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کربلا کے استعارے کو نہایت ہی خوبصورتی اور ہنرمندی کے ساتھ برتا ہے۔جس شعر میں کربلا کو بطور استعارہ برتا گیا ہے، تلازمات، معنویت اور جامعیت کے اعتبار سے وسیع تناظر کا اشارہ دیتے ہیں۔انہی وجوہ اور خصوصیات کی بنیاد پر وہ جدید غزل میں اپنا نمایاں اور منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہیں۔کیوں کہ ان کے اندر جدید تر شاعری کی وہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ہونی چاہئیں۔ انھوں نے فردیت، تنہائی اور وجودیت جیسے موضوعات کے حصار سے باہر نکل کر دیگر موضوعات اور دوسری چیزوں کو اپنے وجدان وشعور کا حصہ بنایا ہے، جس کی وجہ سے استعارے، علامات اور تلمیحات نے معنیات کی نئی دنیا وجود میں لادی ہے، جو کسی طور طلسماتی کرشمہ سے کم نہیں ہے۔ان کی پوری شاعری میں لفظیات اور تراکیب کی سطح پر جو سب سے زیادہ ابھرا ہوا پہلو ہے وہ یہی ہے کہ عہد نو کی آمد کی بشارت نوع بنوع انداز اور طریقوں سے دی گئی ہے اور یقین وگمان کی شمع ہر آن روشن نظر آتی ہے۔اس طرح ان کا شعری کینوس وسیع سے وسیع تر ہوگیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کس کو یہ کشور بے تاج ونگیں ملتی ہے
غیب سے شام وسحر نانِ جویں ملتی ہے

خدا سے آخر رشتہ بھی کٹ نہ جائے کہیں
کہ اب کے ہے مرا دستِ دعا نشانے پر

جراحتیں مجھے کارِ رفو سکھاتی ہیں
مرا عدو ہی مرا چارہ گر نکلتا ہے

عرفان صدیقی کے یہاں ہمیں خارجی حقائق سے زیادہ باطنی حقائق کا حوالہ ملتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں متصوفانہ طرز اظہار کا رنگ تھوڑا گہرا ہوگیا ہے۔ گو کہ وہ کوئی صوفی شاعر نہیں ہیں مگر بزرگوں کی نسبت، خانقاہوں سے رشتہ اور ولیوں کے خانوادے سے ہونے کی وجہ سے ان کا ناطہ روایت سے بہت گہرا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہمیں صوفیانہ رنگ وآہنگ بھی مل جاتے ہیں جو ان کی تہذیبی روایت کے امین ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔انھوں نے جہاں ہنرمندی اور فن کے ساتھ اپنی کلاسیکی روایت کو نکھارتے رہے، وہیں بقائے حیات اور زمانے سے آگاہ بھی رہے۔اس احتیاط اور قدیم وجدید کے ربط وتعلق نے ان کے نطق 'گویائی' کی چمک کو مزید تیز کردیا ہے، جس سے ان کے فن کا ابعادی پہلو ہمیں متحیر کیے بغیر نہیں رہتا۔عرفان صدیقی کی شاعری اپنے عہد کی نمائندہ شاعری ہے، جس کا شعری افق کافی کشادہ ہے اور یہ اپنے ورثے سے مربوط رہنے کا عطیہ ہے۔

○○

○○